# نعم البدل

**پروفیسر شاھدہ شاھین**

371، 6th کراس، بالمقابل نہرو پارک، اُدے گیری، میسور۔570019، کرناٹکا

وہ ایک بے حد اداس اور سوگوار شام تھی۔ تانیہ مخدوم برآمدے میں پڑی ہوئی کرسی پر چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی۔ رشتہ دار اور دوست احباب اس کی نرالی و نایاب ہمت کی داد دیتے ہوئے ابھی ابھی پرسہ دے کر گئے تھے۔ اس کے ابو مخدوم ملک کو گزرے آج تیسرا دن تھا۔ دریں اثنا اس کے غیر معمولی جرأت مندانہ اقدام پر تعریف و توصیف پر مبنی بے شمار فون کالس بھی موصول ہوئی تھیں، لیکن اس خلافِ دستور ارتکابِ عمل کے نتیجے میں اس کے اپنے دل کا چین و سکون درہم برہم ہو چکا تھا۔ وہ خود کو اپنے ابو کی مجرم اور اپنے اس عجیب فیصلے کو ناقابلِ معافی گردان رہی تھی۔

'مخدوم منزل' جو کل تک اس کی شادی خانہ آبادی کی تیاریوں کی گہما گہمی سے پر ہنسی اور شادمانی کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی ماتم کدے میں تبدیل ہو چکی تھی۔ خاصے لمبے عرصے بعد اس در پر خوشیوں نے دستک دی، لیکن استقبال سے پہلے ہی الٹے قدموں لوٹ گئیں۔

آج سے اٹھارہ برس پہلے کینسر کے مہلک مرض نے اس کی امی کی جان لے لی تھی۔ سنا تھا کہ ان کی دردناک موت کے بعد ابو کے خیر خواہوں اور دوستوں نے نکاح ثانی کے لیے ان پر بہت دباؤ ڈالا تھا، لیکن وہ نہ مانے۔ اسے یاد تھا کہ ابو کی پھوپھی جان اپنی طلاق شدہ بیٹی کو لے کر ایک عرصہ ان کے گھر میں ٹکی رہیں۔ منع کرنے کے باوجود ان کی بیٹی نے باورچی خانہ کی ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ جلد ہی ان دونوں کو احساس ہو گیا کہ اس پتھر میں جونک لگنے والی نہیں ہے لہٰذا ایک دن اس کے ابو کے دفتر سے لوٹنے سے پہلے ہی اسے اکیلا چھوڑ کر بوریا بستر گول کر گئیں۔

وہ جانتی تھی کہ اس کے ابو دوسروں سے مختلف ہیں کیونکہ اس کا ہر کام خود اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے۔ ہر دن صبح سویرے اٹھ جاتے۔ اسے ناشتہ کروانے کے ساتھ ساتھ ٹفن باکس بھی تیار کر دیتے۔ پھر اسے تیار کر کے اسکول پہنچانے کے بعد آفس چلے جاتے پھر شام کو واپسی میں اسے لیتے ہوئے گھر آ جاتے۔ ہمیشہ اس کے ساتھ گھر پر ہی رہتے۔ چھٹی والے دن دونوں مل کر شاپنگ کے لیے نکل جاتے۔ ڈھیر سارا سامان خریدنے کے بعد کھانا باہر ہی کھا کر آتے۔ گھر میں کسی تیسرے فرد کی غیر موجودگی میں وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم بن کر رہ گئے تھے۔

شعور کی دنیا میں آتے ہی اس پر منکشف ہوا تھا کہ اپنی بیوی کے دنیا سے چلے جانے کے بعد صرف تانیہ کی خاطر انہوں نے تنہائی کو گلے لگا لیا تھا۔ وہ سوچ کر رہ جاتی آیا ان کی بے لوث قربانی کا نعم البدل مہیا کر پائے گی بھلا..... سیانی ہوتے ہی اس نے گھر کا سارا نظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اپنے ابو کو باورچی خانہ میں قدم بھی نہیں رکھنے دیتی تھی۔ اسی تاک میں رہتی کہ وہ کوئی فرمائش کریں اور فوراً تعمیل کرے۔

اس دن جب وہ کالج کے فائنل امتحان کا آخری پرچہ دے کر گھر لوٹی تو انھوں نے بتایا کہ آج گھر پر کچھ خاص مہمان آنے والے ہیں۔ تھکی ہوئی ہونے کے باوجود وہ مہمانوں کے استقبال کی تیاری میں جٹ گئی۔ وہ تو مہمانوں سے ملنے کے بعد ہی پتہ چلا تھا کہ ان کی تشریف آوری کا مدعا کیا ہے۔ تانیہ کے نین نقش اور رنگ ڈھنگ ملاحظہ کر کے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنے بیٹے کے لیے اس کا رشتہ مانگ لیا۔ تانیہ شرما کر اندر بھاگ گئی تھی۔ مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد جب وہ اس کے کمرے میں آئے اور پرنم آنکھوں کے ساتھ مبارک باد دینے لگے تو تانیہ نے علی الاعلان کہہ دیا کہ وہ انہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جانے والی۔ یہ سنتے ہی یکبارگی ان کے چہرے کا رنگ افسردگی میں تبدیل ہو گیا، بولے:

''لگتا ہے وہ لوگ تمہیں پسند نہیں آئے۔ خیر، کوئی بات نہیں دوسرا رشتہ دیکھ لیں گے۔''

''وہ بات نہیں ہے ابو.....'' وہ ان کے سینے سے لگ کر سسک اٹھی .....''میں آپ کو تنہا چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتی۔''

''اسی شہر میں تو رہو گی! آتی رہنا کبھی کبھار۔'' مخدوم اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے:

''امی کے جانے کے بعد آپ نے دوسری شادی کیوں نہیں کی؟''
تانیہ اچانک پوچھ بیٹھی۔
''وہ اس لیے کہ اپنی لاڈو کے سوتیلی ماں نہیں لانا چاہتا تھا۔''
''آیا میں بھی آپ کی خاطر اسی طرح زندگی نہیں گزار سکتی۔''
وہ فوراً بولے۔''ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔زندگی کا کیا بھروسہ۔ میرے بعد تم اکیلی جان کہاں جاؤ گی؟''

ان کے اصرار پر جب وہ فاران سے ملی تو اس کا ارادہ متزلزل ہوگیا۔فاران کی پرکشش شخصیت کے آگے اس کے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔اس کی آمادگی سے مخدوم بے حد خوش ہوئے۔تانیہ نے ٹھان لیا کہ اپنے ابو کو یوں اکیلا نہیں چھوڑے گی۔ان کی پھوپھی کی لڑکی اگر اب تک کنواری بیٹھی ہو تو وہی سہی۔بہرصورت ان کی دیرینہ تنہائی کا کوئی نہ کوئی مداوا ڈھونڈ کر رہے گی۔

اس کا فائنل امتحان ختم ہوتے ہی مخدوم ملک نے آفس سے لمبی چھٹی لے لی اور شادی کی تیاریاں شروع کردیں۔نہ جانے کیوں ان کو بہت جلدی تھی۔وہ بالکل ایک سگھڑ عورت کی طرح ہر بات کا دھیان رکھ رہے تھے۔بیٹی کی شادی میں کوئی کسر باقی نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ڈھیر ساری شاپنگ.....زیورات،ملبوسات، پکوانوں کی تفصیل وغیرہ وغیرہ۔ دعوت نامہ دینے کے لیے دور اور نزدیکی رشتے داروں کے گھر بہ نفس نفیس خود تشریف لے گئے تھے۔آج تانیہ بھی ان کے ساتھ ہولی۔

چلچلاتی دھوپ برس رہی تھی اور سڑک پر ٹریفک کا اژدھام۔ سامنے سے ایک بس دندناتی ہوئی چلی آرہی تھی۔کترا کر آگے نکل جانے کی تگ ودو میں بائیں طرف سے آتے ہوئے ایک تیز رفتار ٹرک پر ان کی نظر نہیں پڑی اور گاڑی اس سے جا ٹکرائی۔ایک زوردار آواز کے ساتھ گاڑی کا دایاں حصہ ٹرک کی زد میں آکر اندر کو دھنس گیا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ اور اسٹیئرنگ وہیل کے بیچ پھنس کر بے ہوش ہوگئے۔ بدقت تمام انہیں کھینچ کر باہر نکالا گیا اور ایمبولینس میں ڈال کر اسپتال پہنچا دیا گیا۔چشمِ زدن میں سب کچھ ہوگیا۔حیرت کی بات تھی کہ تانیہ کے کھرونچ بھی نہیں آئی تھی۔

وہ آپریشن تھیٹر کے باہر بیٹھی انتظار کی گھڑیاں گن رہی تھی۔اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اندر کس حالت میں ہوں گے۔ویسے ان کے بدن سے خون کا ایک قطرہ نہیں گرا تھا صرف بے ہوش ہوئے تھے اور منہ سے تھوڑا خون بہہ نکلا تھا۔اچانک آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا اور اس کے خیالوں کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔مخدوم کے قریبی دوست اور شہر کے جانے مانے سرجن ڈاکٹر طاہر باہر نکلے اور اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔تانیہ آپریشن تھیٹر کے اندر داخل ہوئی۔ اس کے ابو چپ چاپ آنکھیں موندے اسٹریچر پر لیٹے ہوئے تھے۔سسٹر نے ان کے چہرے پر سے کپڑا ہٹادیا تھا۔تانیہ نے ڈاکٹر انکل کی طرف دیکھ کر پوچھا.....''انہیں کب تک ہوش آجائے گا۔''

ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لی اور متاسفانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔''تمہارے ابو، میرے دوست کو اب کبھی ہوش نہیں آئے گا۔جی توڑ کوشش کے باوجود یہ ہم سب کو چھوڑ کر چلے گئے۔''

ڈاکٹر طاہر کی بات سن کر تانیہ کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا،بجلی کی سی سرعت سے لپک کر انھوں نے تھام نہ لیا ہوتا تو دھڑام سے گر جاتی۔ سسٹر اسے سہارا دے کر دوسرے کمرے میں لے گئی۔کرسی پر بٹھا کر پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگادیا۔تانیہ کے کانوں میں مسلسل اسی منحوس خبر کی بازگشت ہو رہی تھی پھر بھی یقین نہیں آرہا تھا۔ڈاکٹر طاہر کمرے کے اندر داخل ہوئے۔ایک کرسی کھینچ کر اس کے روبرو بیٹھ گئے اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر پرافسوس لہجے میں بولے:

''تمہارے ابو کے سینے پر سخت چوٹ آئی تھی۔اسٹیئرنگ وہیل اندر دھنس جانے کی وجہ سے دائیں پسلیوں کی ہڈیاں چور چور ہوکر پھیپھڑوں میں دھنس گئیں جس کی وجہ سے جائے حادثہ پر ہی ان کی موت واقع ہوگئی تھی۔مشیت ایزدی کے آگے بھلا کس کی چلی ہے۔''ان کے سینے سے ایک آہ نکل گئی۔کچھ ثانیوں کے وقفے کے بعد وہ پھر گویا ہوئے:

''اب میں جو کہنے جا رہا ہوں اسے غور سے سنو.....ہمارے ارد گرد ہزاروں بلکہ لاکھوں مجبور لوگ آنکھ سے اندھے، دل کے مریض، جگر کی تکلیف سے پریشان، گردوں کے درد سے بے حال، کسی نیک دل داتا کی خیرات یا نذرانے کے انتظار میں اپنے دن کاٹ رہے ہیں۔ تکلیف سے عاجز ہوکر رات دن موت کی دعا مانگتے ہیں۔قرآن پاک میں لکھا ہے کہ جس نے ایک جان بچائی گویا اس نے سب لوگوں کی جانیں بچائیں.....چونکہ تمہارے ابو کے اعضائے رئیسہ اپنی اصلی حالت میں صحیح سلامت ہیں۔تم ان کا عطیہ دے کر اپنے ابو کے سانحۂ ارتحال کو ایصالِ ثواب میں تبدیل کرسکتی ہو۔جانتی ہو تانیہ! یہ کتنی عظیم بخشش ہے.....تمہارے اس عمل سے مرحوم کی روح کو مسلسل صدقۂ جاریہ کا اجر ملتا رہے گا۔''

تانیہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہونقوں کی طرح ان کا منہ تکنے لگی۔یکے بعد دیگرے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ رونما ہوتے ہوئے حالات نے

اسے بھونچکا کر کے رکھ دیا تھا۔ کچھ لمحوں پہلے ہنستے مسکراتے ابو کے پہلو میں بیٹھی ہوئی خوش آئند مستقبل کے تانے بانے بن رہی تھی کہ چشم زدن میں وہ موت کا لبادہ اوڑھ کر سو گئے۔ اس صدمے سے ابھری نہیں تھی کہ یہ دوسرا جھٹکا.....ان کے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے تراش کر خیرات کی صورت میں نہ جانے کس کس کے بدن میں منتقل کر دینے کی تجویز!!

وہ تڑپ کر بولی۔ ''انکل پلیز ایسا نہ کہیں، آپ چاہیں تو میرے ہاتھ، پیر، دل، آنکھیں، سارے اعضا لے لیں، لیکن میرے ابو کو بخش دیں۔'' وہ ایک معصوم بچے کی طرح بلک کر رو پڑی۔

ڈاکٹر طاہر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ یہ فیصلہ تمہارے لیے انتہائی مشکل اور تکلیف دہ ہے، لیکن تمہیں اس پر غور کرنا ضروری ہے۔ ایک مردہ انسان کے اعضا بھلا اس کے کس کام کے! کیونکہ ان اعضا کو بالآخر مٹی کے ساتھ مٹی ہو کر فنا ہو جانا ہے۔ اگر یہی اعضا کسی کو نئی زندگی دے سکیں تو یہ انسانیت نوازی کی اعلیٰ ترین مثال ہوگی۔ اس امر پر انسانیت اور شریعت مخصوص توجہ کی متقاضی ہے۔ بے حد افسوس کا مقام ہے کہ اس ضمن میں تاحال آگاہی اور واقفیت کے فقدان کی وجہ سے ہمارے معاشرے کا بہت نقصان ہوا ہے۔

ہندوستان کی نام ور فقہ اکیڈمی کے مطابق اعضائے انسانی کی پیوند کاری میں توہین انسانیت نہیں ہے، حتیٰ کہ اعضا کی بینکنگ کو بھی درست بتایا گیا ہے۔ سعودی عرب کی ہیئت کبار العلماء (علماء کی سپریم کونسل) نے بھی کبار علما کی کثیر رائے سے مردہ انسان کے اعضا کی منتقلی کے جواز کا فتویٰ صادر کیا ہے۔ نیز زندہ انسان کی مصلحت کو مردہ شخص کی مصلحت پر مقدم کرنے کی تحقیق ثابت کی ہے کیونکہ اس عمل میں یہ امید پائی جاتی ہے کہ زندہ شخص میں صحتمندی کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی جبکہ پہلے اس میں یہ صلاحیت مفقود تھی۔ اس سے نہ صرف یہ کہ اس شخص کو بلکہ پوری امت کو فائدہ پہنچنے کا امکان موجود ہے۔''

رنج والم کی زیادتی نے تانیہ کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کر لی تھی، دماغ ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ڈاکٹر طاہر نے ناصحانہ انداز میں کہا:

''وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ میرا یقین کرو، اگر تمہیں ایسے مریضوں سے ملنے اور ان کی تکلیف کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا اتفاق ہوا تو اس قدر متاثر ہو جاؤ گی کہ خود اپنے اعضا بھی عطیہ کرنے کی وصیت کر بیٹھو گی۔ چونکہ تم اپنے ابو کی اکیلی وارث ہو لہٰذا تمہارے دستخط کے بغیر ہم کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔ مجھ پر بھروسہ رکھو اور ان کاغذات پر دستخط کر دو۔ اس فیصلے پر تمہیں کبھی پشیمانی نہیں ہوگی بلکہ ایک ایسے بے کراں سکون اور آفاقی مسرت سے ہم کنار ہونے کا شرف حاصل ہوگا جس کا اس وقت تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ اگر یہ موقع ہاتھ سے گنوا دیا تو زندگی بھر ندامت اور پچھتاوے کی آگ میں جلتی رہو گی۔''

تانیہ نے متعدد اقسام کے صدقوں کے بارے میں سنا تھا، لیکن یہ ایک عجیب وغریب مطالبہ تھا۔ ڈاکٹر طاہر کی باتوں اور ان کی آنکھوں سے جھلکتے ہوئے عزم واعتماد کے زیر اثر اس نے لرزہ بر اندام ہاتھوں سے کاغذات پر دستخط کر دیے اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ ڈاکٹر طاہر نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور جلدی سے باہر نکل گئے۔

مخدوم ملِک نے اپنی راحتِ جاں کے لئے پھولوں کی تمنا کی تھی، لیکن بے رحم وقت صرف خار ہی خار اس کی جھولی میں ڈال کر چلا گیا تھا۔ ان کی ناگہانی موت، پھر ان کے جسم کو چیر پھاڑ کر اندرونی اعضا نکال لینے کا جاں فرسا تصور.....شہنائیوں کی جگہ ماتم، شادمانی کے بدلے لامتناہی غم اور احساس تنہائی نے اسے جیتے جی مار ڈالا۔ ڈاکٹر طاہر اور دوسرے کئی رشتہ داروں کی مخلصانہ کوششوں کے باوجود تانیہ اس صدمے سے باہر نہیں نکل پا رہی تھی۔ ایسے میں اس کا اکیلے رہنا مناسب نہیں تھا۔ بے چارہ فاران بھی کیا کرتا، اس کی اپنی حدیں تھیں۔ شادی سے پہلے ان کا پاس رکھنا ضروری تھا۔

ڈاکٹر طاہر، فاران اور اس کے والد نے باہمی مشورے سے شادی کو اپنی مقررہ تاریخ پر انجام دینے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ تانیہ کی تنہائی اور غم دور کرنے کا بہتر طریقہ اور کوئی نہیں تھا، لیکن تانیہ اس کے لیے تیار نہیں تھی.....ابو کے ماتم پر شادی کا جشن بھلا کیسے منائے، ان حالات میں شادی کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا۔ تانیہ کی ذہنی حالت کے پیش نظر مجبوراً شادی کو کچھ عرصے کے لیے ملتوی کر دیا گیا، لیکن کب تک۔ بالآخر شادی والا دن آ پہنچا، لیکن تانیہ کی حالت میں زیادہ فرق نہیں آیا تھا۔ وہ بدستور اداس تھی، حتیٰ کہ شادی کی تمام رسومات کے دوران بھی صرف اپنے ابو کا خیال اس کے حواس پر چھایا رہا۔

بعد ایجاب وقبول، مبارکبادیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ جانے کیوں تانیہ کو محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے ابو آس پاس ہی کہیں موجود ہیں اور شانہ بشانہ اس کی خوشیوں میں حصہ لے رہے ہیں۔ ڈاکٹر طاہر کی آواز نے اس کی سوچ کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ وہ کہہ رہے تھے:

''تانیہ ذرا دیکھو تو سہی تم سے ملنے کون آیا ہے۔'' ماتھے پر بڑی سی

بندیا لگائے ایک سرخ وسفید رنگت والی مہربان صورت خاتون سامنے کھڑی ہوئی تھیں جن کی حرکات وسکنات سے بیک وقت ممنونیت اور شفقت پھوٹی پڑ رہی تھی۔ وہ وفورِ جذبات میں آگے بڑھیں اور تانیہ کو گلے لگالیا۔

''یہ مسز راٹھور ہیں جو گردوں کے کہنہ مرض سے عاجز آ کر ہمیشہ اپنے لیے موت کی دعا مانگا کرتی تھیں۔ تمہارے ابو کے ذریعے ان کو ایک نئی زندگی مل گئی۔'' ڈاکٹر طاہر نے ان کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ان کے سینے سے لگتے ہی تانیہ کو ایک ایسے اچھوتے لمس کا احساس ہوا جس کے لیے وہ ہمیشہ ترستی رہی تھی۔ ممتا کی آسودگی و گرمجوشی سے شرابور لمس جس سے جدا ہونے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ایک دوسرے شخص کو آگے کرتے ہوئے ڈاکٹر طاہر بولے:

''اور یہ پروفیسر ریاض ہیں۔'' مسز راٹھور کے سینے سے لگے لگے تانیہ نے ان کی طرف دیکھا اور اپنی پلکیں جھپکانا بھول گئی۔ ان آنکھوں میں تیرتی ہوئی مانوس اور مقناطیسی کشش کو دیکھتے ہی وہ مارے حیرت کے بت بن کر رہ گئی۔

''جانتی ہو تانیہ! پروفیسر ریاض کی آنکھوں کی روشنی تمہارے ابو کی مرہونِ منت ہے۔'' ڈاکٹر طاہر کی آواز سن کر تانیہ اپنے حواس میں آ گئی اور دیکھا..... ان آنکھوں میں بالکل وہی شفقت اور محبت کے ملے جلے تاثرات کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ایک سمندر موجزن ہے۔ اچانک اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، وہ براہِ راست ابو کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی..... بارِ عقیدت ان آنکھوں کو چوم لینے کی خواہش کو بمشکل دل میں دبانا پڑا۔ دریں اثنا وہ ایک اور ہستی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہے تھے:

''اور یہ وہی انسان ہیں جن کے سینے میں تمہارے ابو کا دل دھڑک رہا ہے۔'' پروفیسر ریاض کی آنکھوں سے نگاہیں ہٹاتے ہوئے تانیہ نے ادھر دیکھا۔ ان پر نظر پڑتے ہی اس کا دل آب آب ہو گیا، گلے میں پھندا سا پڑ گیا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لطیف صدیقی اس کے جذبات کو پہچان گئے۔ پدرانہ شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ وہ ان کے سینے میں دھڑکتے ہوئے دل کی آواز ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگی..... مانو ان ذی روح ہستیوں کی دھڑکنوں اور نگاہوں کے توسط سے اس کے ابو اپنے وجود کے جاوداں ہونے کا ادراک کرا رہے تھے۔ دریں اثنا لطیف صدیقی اسے نئی زندگی میں قدم رکھنے کی مبارکباد دیتے ہوئے دعائیں دینے لگے..... یہ تو براہِ راست ابو کے دل سے اس کے لیے دعا نکل رہی تھی۔ وہ شدتِ جذبات سے مغلوب ہو گئی اور ان سے الگ ہو کر اپنا سر فاران کے کندھے پر ٹکا دیا۔ اس کی ذہنی حالت کو محسوس کرتے ہوئے فاران نے اپنی بانہہ اس کے گرد حمائل کر دی اور جھک کر سرگوشی میں بولا۔ ''اپنے دماغ پر زیادہ بوجھ مت ڈالو۔ انشاءاللہ سب ٹھیک ہوگا۔''

ڈاکٹر طاہر اسے مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہے تھے: ''شدید خواہش کے باوجود وہ خاتون آنے سے رہ گئیں جن کے جگر کی پیوندکاری کی گئی ہے کیونکہ ان کو ابھی کچھ عرصہ آرام کی ضرورت ہے۔ فی الوقت انہوں نے اپنی دعائیں بھیجی ہیں اور جلد ہی تم سے ملنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔''

آنکھوں میں تشکر کے جذبات سموئے ممنونیت سے بھرپور لہجے میں وہ بول اٹھی: ''انکل، آپ نے مجھے شادی کا سب سے قیمتی تحفہ دیا ہے۔ ایک عظیم شادمانی، لامحدود طمانیت اور بے کراں سکوں جسے لفظوں کا جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔ خدانخواستہ اگر اس دن میں نے آپ کی پیش کردہ تجویز رد کر دی ہوتی تو یقیناً ابو کی روح بھی مجھ سے شاکی ہوتی..... یہ جسدِ خاکی بھی اب آپ کی امانت ہے۔ جب میرا وقت آ جائے تو عطیہ لینے پہنچ جانا، دیکھنا کہیں دیر نہ ہو جائے۔''

ڈاکٹر طاہر فوراً بولے۔ ''اس وصیت کے لئے قانونی دستاویز تیار کرنے پڑیں گے جسے میں اپنی فائل میں محفوظ رکھوں گا۔ تمہاری خواہش کے مطابق ٹھیک وقت پر کوئی بھی انچارج یہ کام سرانجام دے سکتا ہے۔''

وہ یکلخت خاموش ہو گئے اور محجوب ہو کر بولے۔ ''معاف کرنا۔ شادی خانہ آبادی کے مبارک موقع پر نہ جانے کون سا خشک موضوع لے بیٹھا۔ دراصل میں اس معاملے میں ذرا پراکٹیکل واقع ہوا ہوں، سرجن ہوں نا، بہرحال تم دونوں کو ایک خوشگوار زندگی کی نئی خوشیاں مبارک ہوں۔''

فاران نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بات نہیں انکل بلکہ عطیہ دِہندہ کے طور پر میرا نام بھی لکھ لیجئے گا۔ صدقِ دل سے کہہ رہا ہوں۔''

ڈاکٹر طاہر مسکراتے ہوئے بولے۔ ''ہنی مون گزار کر لوٹنے کے بعد اطمینان سے کسی دن میرے دفتر آ جانا۔ مجھے امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ تم دونوں کے اس مستحسن اقدام سے بے شمار اشخاص کو ایک نئی تحریک ملے گی۔''

○○